سبق : 1

تعلیم القرآن

آن لائن اکیڈمی

(سورۃ ھود ، آیت 1 تا 8)

سُوْرَةُ هُوْدٍ ١١ مَكِّيَّةٌ ٥٢ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا ١٢٣ رُكُوْعَاتُهَا ١٠

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد رحم کرنے والا ہمیشہ رحم والا ہے

الٓرٰ قف كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ﴿۱﴾

الٓرٰ۔ یہ ایک عظیم کتاب ہے جس کی آیات کو محکم بنایا گیا ہے، پھر انھیں کامل حکمت والے، مکمل خبر رکھنے والے (رب) کی طرف سے تفصیلاً بیان کیا گیا ہے ①

سورۂ ہود مکی سورت ہے۔ اس کا نام اللہ کے نبیوں میں سے ایک برگزیدہ نبی ہود علیہ السلام کے نام پر ہے۔ اس سورت میں قومِ عاد کا قصہ بیان ہوا ہے جن کی طرف ہود علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اگرچہ اس سورت میں اور بھی بہت سے قصے ہیں لیکن قومِ عاد کے قصے کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو ہود علیہ السلام کی طرف نسبت دی ہے۔ قرآن مجید کی ساری سورتوں کے نام توقیفی ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ اللہ رب العالمین کی طرف سے ہیں۔ اپنی طرف سے کوئی قاعدہ اور کلیہ مقرر نہیں کیا جائے گا۔ پورا قرآن رب تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتے کے ذریعے خود اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ فرمایا ہے کہ سورتوں کے نام کیا ہیں اور کون سی آیت ترتیب میں کس مقام پر ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: آپ تو بوڑھے ہو چلے؟ آپ نے فرمایا: ”مجھے سورۂ ہود، واقعہ، مرسلات، ”عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ“ اور سورۂ ”اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ“ نے بوڑھا کر دیا ہے۔“ [سنن الترمذي، أبواب التفسير، باب ومن سورة الواقعة: ٣٢٩٧، صححه الألباني]

آیت 1 الٓرٰ: یہ حروفِ مقطعات ہیں جو کہ بعض سورتوں کے شروع میں آئے ہیں۔ ان کی تفصیل پیچھے بیان ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں نازل کر کے قرآن مجید کی حقانیت کو بیان کیا ہے۔ یہ حروف لکھنے میں اکٹھے ہیں لیکن پڑھنے میں الگ الگ ہیں۔ یہ جس طرح نازل ہوئے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اسی طرح بیان فرما دیا ہے۔

كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ: قرآن مجید بہت عظمت والی کتاب ہے۔ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر نازل ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تلاوت فرمایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس تلاوت کو آپ سے سن کر محفوظ کیا۔ صحابہ کے دور میں ہی اس کی کتابت ہوئی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں کاتبینِ وحی کو مقرر کیا جن کا کام صرف قرآن مجید لکھنا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود سارا قرآن لکھوایا۔ اس کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تو انھوں نے بہت سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن کے پاس قرآن محفوظ تھا ان سے جمع کیا اور اسے باقاعدہ کتابی شکل میں محفوظ کیا گیا۔ اللہ رب العالمین فرماتے ہیں کہ یہ قرآن ایک کتاب یعنی لکھا ہوا نوشتہ ہے جو

تمھارے پاک پروردگار کی طرف سے ہے۔ یہاں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس کتاب کا نزول سے لے کر ترتیب تک کا کام خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اسی نے اپنے نبی کو پہنچایا اور پھر آپ ﷺ نے اسے لکھوایا۔ اللہ رب العزت نے قرآن کی آیات کو محکم کر دیا۔ یہ اپنے معنی کے اعتبار سے بہت واضح اور ٹھوس ہیں، یعنی جو کوئی اسے پڑھ کر ہدایت حاصل کرنا چاہے اس کے لیے کسی قسم کی کوئی دقت اور پریشانی نہیں ہے۔

سورۂ آل عمران (۷) میں اللہ رب العالمین نے فرمایا ہے کہ قرآن کی بعض آیات محکمات ہیں اور بعض متشابہات یعنی جن کے ایک سے زیادہ معانی سمجھے جاسکتے ہیں، اس لیے متشابہ کو محکم پر پیش کر کے ان کا معنی اور مفہوم سمجھا جائے گا۔ اس سے یہ ہوگا کہ کسی غلطی اور اشتباہ کی وجہ سے کوئی دوسرا معنی حاصل کرنا چاہے تو نہیں کر سکے گا۔ اللہ تعالیٰ نے خود یہ قاعدہ مقرر فرما کر پورے قرآن کو ایک محکم کتاب کی شکل دی ہے۔ اس میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کا انکار کیا جاسکے۔ یہ بات بھی یاد رہے کہ قرآن ایسی کتاب ہے جو منسوخ نہیں ہے۔ پہلی کتابیں جب نازل ہوئیں تو ایک کتاب دوسری کو منسوخ کرتی رہی لیکن قرآن مجید ایسی کتاب ہے کہ جس نے سب کتابوں کو منسوخ کر دیا ہے۔ اب یہ ناسخ اور محکم کتاب ہے۔ یہ ہر چیز میں ہدایت دینے کے اعتبار سے مکمل ہے۔ اس کی یہ حیثیت اللہ تعالیٰ نے خود مقرر فرمائی ہے۔

ثُمَّ فُصِّلَتْ : ''پھر انھیں تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔'' یعنی آیت کا معنی کیا ہے اور اس پر عمل کیسے ہوگا؟ یہ ساری چیزیں تفصیل کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کو اپنے نبی ﷺ پر نازل کیا اور نبی ﷺ نے پھر اسے آگے پڑھایا، سمجھایا اور اس کے مفہوم کو واضح کیا ہے۔ جو کوئی کتاب کا صحیح علم اور فہم حاصل کرے گا اور وہ مفہوم جو رب تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو اور آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بتایا اسے اختیار کرے گا اسے مکمل طور پر ہدایت مل جائے گی۔ مفسرین نے یہ نکتہ بھی بیان فرمایا ہے کہ کتاب میں قرآن کے ساتھ سنت بھی شامل ہے۔ قرآن کے مفہوم کا تعین اللہ کے رسول ﷺ نے کیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سمجھایا ہے۔ اسی طرح قرآن اور حدیث کی وضاحت میں فہم سلف کا ہونا ضروری ہے۔ اپنے فہم کے مطابق تفسیر کرنے سے امت میں انتشار اور افتراق پیدا ہوگا۔ جیسا کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ((مَنْ فَسَّرَ الْقُرْآنَ أَوِ الْحَدِيْثَ وَتَأَوَّلَهُ عَلٰى غَيْرِ التَّفْسِيْرِ الْمَعْرُوْفِ عَنِ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِيْنَ فَهُوَ مُفْتَرٍ عَلَى اللّٰهِ مُلْحِدٌ فِيْ آيَاتِ اللّٰهِ مُحَرِّفٌ لِلْكَلِمِ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَهٰذَا فَتْحٌ لِبَابِ الزَّنْدَقَةِ وَالْإِلْحَادِ وَهُوَ مَعْلُوْمُ الْبُطْلَانِ بِالْاِضْطِرَارِ مِنْ دِيْنِ الْإِسْلَامِ)) [مجموع الفتاوى : ۱۳ / ۲۴۳] ''جس نے قرآن یا حدیث کی ایسی تفسیر یا تاویل کی جو صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کی تفسیر کے خلاف ہے تو وہ اللہ پر افترا پردازی کرنے والا، اللہ کی آیات سے انحراف کرنے والا اور قرآن کے الفاظ کو ان کی جگہوں سے پھیرنے والا ہے۔ اس سے زندیقیت اور الحاد کا دروازہ کھلتا ہے اور ایسی تفسیر واضح طور پر باطل اور دینِ اسلام سے انحراف ہے۔''

بڑے بڑے کبار صحابہ رضی اللہ عنہم جیسا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر کو بڑا سنگین جرم قرار دیتے تھے، وہ فرماتے تھے: ((أَيُّ أَرْضٍ تُقِلُّنِيْ، وَأَيُّ سَمَاءٍ تُظِلُّنِيْ إِذَا قُلْتُ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِيْ)) [شرح السنة للبغوي: ۲۶۴/۱۔ جامع بیان العلم وفضله: ۸۳۴/۲] ''اگر میں قرآن کے متعلق اپنی رائے سے بات کروں تو کون سی زمین میرا بوجھ اٹھائے گی اور کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا۔'' اسی طرح عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''کوئی امت کبھی ہلاک نہیں ہوئی جب تک وہ قرآن کو سلطان (حاکم) کے خلاف نہ کھڑا کر لے۔'' سلیمان (راوی) کہتے ہیں کہ میں نے حمید سے پوچھا، لوگ قرآن کو سلطان کے خلاف کیسے کھڑا کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا، کیا تم نے خوارج کو نہیں دیکھا کہ وہ قرآن کی تاویل (غلط تعبیر) کر کے اسے سلطان کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔'' [إتحاف الخيرة المهرة: ۷۳۷۵] عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی بات صحیح معنوں میں موجودہ دور کے کچھ لوگوں پر صادق آتی ہے کہ جو نہ تو اپنی زندگی کا مقصد توحید کو سمجھتے ہیں اور نہ ہی اس کے بارے میں محنت کر کے اصلاحِ امت پر توجہ کرتے ہیں۔ بعض ملکوں میں اس وقت اگر حکومتوں کے خلاف خروج اور مسلح بغاوت کی کیفیت دکھائی دیتی ہے تو یہ قرآن کریم کی غلط تاویل کے اثرات اور نتائج ہیں۔

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دور سے لے کر آج تک جتنی بغاوتیں ہوئی ہیں ان کی بنیاد قرآن کریم کی غلط تفسیر تھی۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو خوارج کے بارے میں آگاہ کیا کہ خوارج کے دھوکے میں مت آنا، فرمایا ان کی نشانی یہ ہے کہ وہ قرآن کریم کو پڑھتے ہیں لیکن یہ قرآن ان کے حلقوں سے نیچے نہیں اترتا۔ [دیکھیے صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب التحریض علی قتل الخوارج: ۱۰۶۶] اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ وہ قرآن سے غلط استدلال کرتے ہیں۔ اس لیے جب ابن عباس رضی اللہ عنہما خوارج کو سمجھانے کے لیے ان کے پاس آئے تو فرمایا: ((أَتَيْتُكُمْ مِنْ عِنْدِ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ، وَمِنْ عِنْدِ ابْنِ عَمِّ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَصِهْرِهِ، وَعَلَيْهِمْ نُزِّلَ الْقُرْآنُ، فَهُمْ أَعْلَمُ بِتَأْوِيْلِهِ مِنْكُمْ)) [السنن الكبرى للنسائي: ۴۸۰/۷، ح: ۸۵۲۲] ''میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ یعنی انصار و مہاجرین اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد اور ان کے داماد (علی رضی اللہ عنہ) کی طرف سے تمھارے پاس آیا ہوں۔ ان کی زندگی میں قرآن نازل ہوا تھا، لہٰذا وہ تم سے زیادہ قرآن کی تفسیر کا علم رکھتے ہیں۔''

ابن عمر رضی اللہ عنہما خوارج کو اللہ تعالیٰ کی بدترین مخلوق سمجھتے تھے کہ انھوں نے وہ آیات جو کافروں کے بارے میں نازل ہوئی تھیں انھیں مسلمانوں پر چسپاں کر دیا۔ [دیکھیے صحیح البخاري، کتاب استتابة المرتدين، باب قتل الخوارج، قبل حدیث: ۶۹۳۰] اسی طرح ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ((فَمَنْ ظَنَّ أَنَّهُ يَأْخُذُ مِنَ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ بِدُوْنِ أَنْ يَقْتَدِيَ بِالصَّحَابَةِ وَيَتَّبِعُ غَيْرَ سَبِيْلِهِمْ فَهُوَ مِنْ أَهْلِ الْبِدَعِ وَالضَّلَالِ)) [مختصر الفتاوى المصرية

اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِیۡ لَكُمۡ مِّنۡهُ نَذِیۡرٌ وَّ بَشِیۡرٌ ۙ﴿۲﴾

یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، بے شک میں اس کی طرف سے تمھارے لیے ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں ②

’’جو شخص صحابہ رضی اللہ عنہم کی اقتدا چھوڑ کر ان کے راستے کے علاوہ کسی اور راستے پر چلتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ کتاب وسنت پر عمل کر رہا ہے تو وہ اہلِ بدعت اور گمراہ لوگوں میں سے ہے۔‘‘ [۲/ ٤١١ :

جب کتاب میں قرآن اور سنت کو اکٹھا کیا جائے گا تو اس کا مفہوم بھی آسانی ہو گا اور سنت سے عمل واضح ہونے کی صورت میں کسی قسم کے شبہ اور اختلاف کی گنجائش بھی ختم ہو جائے گی۔ کتاب کے معنی کے تعین میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ہدایت کی کتاب ہے اور یہ ساری کی ساری بات ذہنوں میں واضح ہونی چاہیے۔

مِنۡ لَّدُنۡ حَكِيۡمٍ خَبِيۡرٍ : کامل حکمت والے اور بڑی خبر رکھنے والے کی طرف سے اس قرآن کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید کا ہر حکم اور اس کی ایک ایک آیت پُر حکمت ہے۔ دنیا میں بڑے بڑے دانش ور، عقل وفہم والے اور علوم وفنون کے ماہرین موجود ہیں لیکن یہ قرآن کسی کی کاوش نہیں ہے۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ رب العالمین نے بڑا حکیم بنایا تھا لیکن یہ قرآن ان کی طرف سے بھی نہیں ہے۔ یہ صرف اور صرف خالقِ کائنات کی حکمت ہے۔ جو کچھ اس کتاب میں بیان ہوا ہے وہی سب سے بڑی حکمت اور سب سے بڑی دانش ہے۔ یہ رب کے احکام ہیں جس سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اس ذات باری تعالیٰ کے پیغام کو سمجھنے کی کوشش کرے۔

آیت 2 ﴾ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ : قرآن مجید کا اصل موضوع اللہ کی توحید ہے۔ پُر حکمت، پُر عظمت اور محکم آیات پر مشتمل اس کتاب کا مقصد یہی بات سمجھانا ہے کہ عبادت اللہ کے لیے خالص ہونی چاہیے۔ معبود برحق وہی ذات ہے اور کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ قرآن میں سب سے زیادہ کلام توحید پر ہوا ہے اور اسی حوالے سے زیادہ دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ جتنے نبی دنیا میں آئے سب نے رب تعالیٰ کی عبادت کی دعوت دی اور غیر اللہ کی عبادت سے بچنے پر زور دیا ہے۔ فرمایا: ﴿ وَ لَقَدۡ بَعَثۡنَا فِیۡ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوۡلًا اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَ اجۡتَنِبُوا الطَّاغُوۡتَ ﴾ [النحل : ٣٦] ’’اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔‘‘ اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿ وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِیۡۤ اِلَیۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ ﴾ [الأنبياء : ٢٥] ’’اور ہم نے آپ سے پہلے جس رسول کو بھی بھیجا اسے یہی وحی کرتے رہے کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی الٰہ نہیں، پس میری ہی عبادت کرو۔‘‘ تم نے غیر اللہ کے نام پر جتنے الٰہ بنا رکھے ہیں سب باطل ہیں۔ یہ شرک ہے اور اس سے ہر صورت بچنا چاہیے۔

وَّ يُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۳

صاحبِ فضل کو اس کا فضل عطا فرمائے گا اور اگر تم روگردانی کرو گے تو میں تمھارے بارے میں بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ③

بندہ جب سمجھتا ہے کہ مجھے اپنے مستقبل کو سنوارنے کے لیے پرانی غلطیوں کو نہیں دہرانا تو یہ چیز اسے بہت فائدہ دیتی ہے۔ اگر استغفار کے ساتھ آئندہ کے لیے گناہوں سے توبہ نہ ہو تو یہ محدود ہے۔ اصل مقصود اصلاح ہے اور اصلاح ہمیشہ توبہ کے ساتھ ہوتی ہے۔ بندہ اپنے سابقہ گناہوں کی معافی طلب کرتے ہوئے خالقِ کائنات کی طرف رجوع کرے اور دیکھے کہ اللہ رب العالمین اسے کیا حکم دے رہے ہیں اور قرآن اسے کیا سمجھا رہا ہے۔ ان چیزوں کی پابندی لازم ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ بندہ اپنے باپ دادا کی غلطی تسلیم کرے اور پھر اسی روش پر قائم بھی رہے۔ اس رویے کی اصلاح بہت ضروری ہے۔

يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى : جب تم استغفار کرتے ہوئے آئندہ کے لیے گناہوں سے توبہ کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمھیں دنیا میں متاعِ حسن کا تحفہ عطا فرمائیں گے۔ دنیا کی مدت مقرر ہے اور یہ ایک محدود سلسلہ ہے جبکہ جنت و دوزخ اور آخرت ہمیشہ کے لیے ہے۔ جو بندہ توبہ و استغفار کر کے راہِ راست پر زندگی بسر کرے گا اس کی زندگی کا جتنا وقت اللہ نے مقرر کر دیا ہے وہ بہت اچھا اور اطمینان وسکون والا گزرے گا۔ اللہ کی شریعت پر عمل کرنے سے بندے کو دنیا میں بھی سکون اور امن حاصل ہوتا ہے اور اگر بندہ اپنے رب کے ساتھ مخلص نہ ہو تو وہ دنیا میں جتنا چاہے مال و دولت کا مالک ہو اسے کبھی سکون و اطمینان حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دوسرے مقام پر ﴿ مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴾ [الحديد : ۲۰] کہا ہے کہ یہ لوگ خود بھی دھوکے میں ہیں اور دوسروں کو بھی دھوکا دینے والے ہیں۔ دنیا کے دھوکے میں مبتلا ہو کر انھوں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے لیکن یہ متاعِ غرور میں مبتلا ہیں۔ اس کے برعکس متاعِ حسن اچھی اور پرسکون زندگی کو کہتے ہیں۔ یہ زندگی صرف ایک ایمان والے شخص کی ہی ہوسکتی ہے جو توبہ و استغفار کرتا اور دین حق پر کاربند رہتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ﴾ [النحل : ۹۷] ''جو شخص نیک عمل کرے، خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اسے ضرور پاکیزہ زندگی عطا کریں گے۔''

یہاں یہ بات سمجھ لیں کہ ایک تو یہ ہے کہ انسان کفر و شرک کا مرتکب ہو اور اس کے بعد توبہ و استغفار کر کے اپنے آپ کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھال لے اور دوسرا یہ ہے کہ اگر متاعِ حسن اور دنیا میں مستقل فائدے والی بات سمجھنی ہے تو وہ بھی توبہ و استغفار کے ساتھ وابستہ ہے۔ انسان اسلام قبول کرنے کے بعد بھی غلطی کرتا ہے۔ ایسا نہیں

ہے کہ نافرمانیوں کے مرتکب صرف کافرہی ہوتے ہیں۔ اللہ کی ہر نافرمانی گناہ ہے اور عقیدے و اعمال کی کمزوریوں کے سبب مسلمانوں سے بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان گناہ کریں تو وہ بخشے ہوئے ہیں، جیسا کہ ہمارے ہاں بہت سارے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ چونکہ ہم نبی ﷺ کی امت ہیں اور ہم نے کلمہ پڑھ کر اپنے آپ کو اسلام سے وابستہ کرلیا ہے، لہٰذا اب ہم نماز نہ بھی پڑھیں اور صدقہ و خیرات سمیت دیگر نیک اعمال نہ بھی کریں اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا ہے۔ یہ انتہائی غلط تصور ہے جو لوگوں کے ذہنوں میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس سارے سلسلہ کی اصلاح بہت ضروری ہے۔

قرآن مجید مسلمانوں کو اس بات کی دعوت دے رہا ہے کہ تم سے بھی جب کبھی کوئی غلطی اور گناہ ہو جائے تو تمھیں چاہیے کہ رب تعالیٰ سے گناہوں کی معافی مانگو اور توبہ و استغفار کرو، یعنی بندے کو ہر وقت اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے رہنا چاہیے۔ انسان سے صغیرہ اور کبیرہ گناہ ہوتے رہتے ہیں، بعض اوقات انسان کو پتا ہی نہیں چلتا اور وہ غلطی یا گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے: ((أَسْتَغْفِرُكَ لِمَا تَعْلَمُ، إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ)) [مسند أحمد: ٤/ ١٢٣، ح: ١٧١١٤] ”اے اللہ! میں تجھ سے معافی مانگتا ہوں ان گناہوں کے بارے میں جو صرف تجھے معلوم ہیں، بے شک تو غیبوں کو بہت زیادہ جاننے والا ہے۔“ اس لیے کثرت سے توبہ و استغفار کرنے میں ہی انسان کی بھلائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ”میں ایک دن میں ایک سو مرتبہ اللہ رب العالمین سے معافی مانگتا ہوں۔“ [صحیح مسلم، كتاب الذكر والدعاء، باب استحباب الاستغفار ....: ٢٧٠٢] ایک حدیث میں ستر مرتبہ کے الفاظ بھی ہیں۔ [سنن الترمذي، أبواب التفسير، باب ومن سورة محمد ﷺ: ٣٢٥٩] نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے معصوم بنایا اور قرآن میں اعلان کیا ہے کہ آپ کی تمام لغزشیں اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دی ہیں۔ اس کے باوجود آپ ﷺ ایک دن میں سو مرتبہ استغفار کرنے کی بات کر رہے ہیں۔ یہ درحقیقت امت کی تربیت کی جا رہی ہے کہ انسان کو کبھی یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ غلطی نہیں کرسکتا۔ اس سے بندے کے دل میں تکبر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

عام طور پر بعض صوفیا میں یہ باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں کہ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان سے کسی قسم کی کوئی غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ بات قطعی طور پر غلط ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے علاوہ کسی کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح معصوم نہیں بنایا۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو اس سے دنیا میں غلطیاں ہوتی ہیں، اس لیے استغفار کو ایک رویے کے طور پر اختیار کرنا چاہیے۔ بعض اوقات انسان سمجھتا ہے کہ اس نے بہت اچھا عمل کرلیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ عمل کے قابلِ قبول ہونے کا فیصلہ اللہ رب العالمین نے کرنا ہے۔ عمل کرنے کے بعد بھی بندے کے دل میں یہی احساس ہونا چاہیے کہ کہیں مجھ سے کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی۔ اللہ کے نبی ﷺ نے اپنی امت کو استغفار کی بہت زیادہ ترغیب دی ہے۔ وضو کے بعد جو دعا سکھائی

گئی ہے اس میں بھی یہی ہے: ((اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ، وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ)) [سنن الترمذي، أبواب الطهارة، باب مايقال بعد الوضوء: ٥٥] اے اللہ! میں اپنی غلطی تسلیم کر کے اصلاح کرنے والا ہوں، مجھے توبہ اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں میں شامل کر لے۔

آپ دیکھ لیں کہ بندہ وضو کر کے آیا ہے لیکن بات یہ سمجھائی جارہی ہے کہ اگرچہ وضو کرنا بہت اچھا اور نیک عمل ہے لیکن پھر بھی توبہ کرنی ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب نماز کی امامت کرواتے تو نماز ختم ہونے پر بلند آواز میں اللہ اکبر کہتے۔ [صحیح البخاري، کتاب الأذان، باب الذکر بعد الصلاۃ: ٨٤٢] پھر تین مرتبہ '' أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ '' کہتے۔ [صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب استحباب الذکر بعد الصلاۃ...: ٥٩١] آپ ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی ایسا ہی کرتے۔ یہ اس چیز کی علامت ہوتی تھی کہ نماز مکمل ہو گئی ہے۔ [دیکھیے صحیح البخاري، کتاب الأذان، باب الذکر بعد الصلاۃ: ٨٤١] نماز اتنا خوب صورت عمل ہے کہ اس میں قیام، رکوع وسجود اور اذکار کا اہتمام کیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود سلام پھیرنے کے بعد تین مرتبہ ''استغفر اللہ'' کہا جارہا ہے۔ گویا اس موقع پر بھی یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ نیکی کرنے والوں کو بھی استغفار کرتے ہی رہنا چاہیے۔ نماز کے دوران لازمی بات ہے بندے کا خیال اِدھر اُدھر ہو جاتا ہے اور کوئی نہ کوئی کوتاہی ہو جاتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے کی ہدایت کی جارہی ہے۔

مؤمن ہر وقت اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اللہ رب العالمین کے ہاں میرا عمل مقبول ہو اور کسی بھی عمل میں مجھ سے کوئی کمزوری نہ رہ جائے اور اگر بالفرض ایسا ہو جائے تو رب تعالیٰ کی مغفرت اس کمزوری کو ختم کر دے۔ سب مسلمانوں کا رویہ یہی ہونا چاہیے کہ وہ توبہ و استغفار کو لازم پکڑیں اور چھوٹے سے چھوٹے گناہوں سے بھی بچنے کی کوشش کریں۔ جو لوگ ہر وقت معافی مانگتے رہتے ہیں ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ متاع حسن سے نوازیں گے اور دنیا میں بھی ان کی زندگی بہت پرسکون اور پر امن ہو گی۔ سکون صرف وہی حاصل کرتے ہیں جو اللہ رب العزت کے سامنے عاجزی و انکساری کے ساتھ رہتے ہیں، کسی بات پر تکبر نہیں کرتے اور ان کا سارا اعتماد خالقِ کائنات کی رحمت، مغفرت اور بخشش پر ہوتا ہے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''ایک بندے نے بہت گناہ کیے اور کہا: اے میرے رب! میں تیرا ہی گنہگار بندہ ہوں تو مجھے بخش دے۔ اللہ رب العزت نے فرمایا: ''میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی رب ضرور ہے جو گناہ معاف کرتا ہے اور گناہ کی وجہ سے سزا بھی دیتا ہے، میں نے اپنے بندے کو بخش دیا'' پھر بندہ رکا رہا جتنا اللہ نے چاہا اور پھر اس نے گناہ کیا اور عرض کیا: اے میرے رب! میں نے دوبارہ گناہ کر لیا، اسے بھی بخش دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا رب ضرور ہے جو گناہ معاف کرتا ہے اور اس کے بدلے میں سزا بھی

دیتا ہے، میں نے اپنے بندے کو بخش دیا۔‘‘ پھر جب تک اللہ نے چاہا بندہ گناہ سے رکا رہا اور پھر اس نے گناہ کیا اور اللہ کے حضور میں عرض کیا: اے میرے رب! میں نے پھر گناہ کرلیا ہے تو مجھے بخش دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ’’میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا ایک رب ضرور ہے جو گناہ معاف کرتا ہے اور اس کی وجہ سے سزا بھی دیتا ہے، میں نے اپنے بندے کو تین مرتبہ بخش دیا۔ پس اب جو چاہے عمل کرے۔‘‘ [صحيح البخاري، كتاب التوحيد، باب قول الله تعالى : ﴿ يريدون أن يبدلوا كلام الله ﴾ : ٧٥٠٧]

وَ يُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ: ’’اور ہر صاحبِ فضل کو اس کا فضل عطا فرمائے گا۔‘‘ فضل کا معنی زائد ہے، مثلاً فرض نماز ادا کی تو ساتھ نفل پڑھ لیے، فرض روزے رکھے تو ساتھ نفل رکھ لیے، اسی طرح زکاۃ دی تو اس کے ساتھ صدقہ وخیرات بھی ادا کرتے رہے، یعنی جتنا کوئی زائد عمل کرے گا اسے اتنا ہی زیادہ اجر دیا جائے گا۔ یہ رب تعالیٰ کی شفقت کا ایک نظام ہے کہ انسان جب گناہ کرتا ہے تو ہر گناہ اتنا ہی لکھا جاتا ہے لیکن جب کوئی نیکی کرتا ہے تو ایک نیکی کا اجر دس سے ستر اور سات سو گنا تک بڑھا دیا جاتا ہے۔ نیکی جس قدر شان دار ہو گی اسی حساب سے بندے کو زیادہ اجر سے نوازا جائے گا۔ یہ اللہ کا فضل ہے اور مسلمان ہر وقت اپنے رب کے فضل کی تلاش میں رہتا ہے۔

وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ . . . : اللہ رب العالمین فرماتے ہیں کہ تمھیں راستہ بتا دیا اور اصلاح کا طریقہ سمجھا دیا ہے۔ تم غلطیوں پر توبہ و استغفار کرو گے تو تمھاری دنیا بھی اچھی ہو جائے گی اور آخرت بھی اچھی ہو جائے گی۔ ہر عمل کا بدلہ تمھیں بہت اچھا ملے گا اور اللہ کا فضل میسر آئے گا لیکن اگر تم اپنی غلطیوں پر اڑے رہو گے کہ ہم اپنے باپ دادا اور بزرگوں کے طریقے پر رہیں تو یہ دین نہیں ہے۔ دین صرف وہی ہے جو آسمانوں سے وحی کے ذریعے محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف بھیجا گیا ہے۔ اگر تم اس سے منہ پھیرو گے تو مجھے ڈر ہے کہ بڑے دن کا عذاب تمھیں گھیر لے گا۔ اللہ کے رسول ﷺ اپنی امت سے یہی کہہ رہے ہیں کہ میں تمھارا خیر خواہ ہوں اور میری دعوت کا مقصد تمھیں اللہ کی پکڑ اور اس کے عذاب سے بچانا ہے۔ مجھے شدید تکلیف اور پریشانی ہوتی ہے جب میں تمھیں غلطیوں میں مبتلا دیکھتا ہوں۔ تمھیں چاہیے کہ ایک خیر خواہ انسان کی بات کو غور سے سنو، سمجھو اور دین کی طرف واپس پلٹ آؤ۔ میرا مقصد تمھیں توحید اور دین کی دعوت پر واپس لا کر کسی قسم کا ذاتی فائدہ اٹھانا نہیں ہے۔ میں تو تمھارے فائدے کے لیے سب کچھ کر رہا ہوں۔ سچی بات ہے کہ داعی حضرات کو ایسے ہی مخلص ہونا چاہیے۔ نبی ﷺ کو ہر وقت یہ احساس ہوتا تھا کہ میری امت کے لوگ اللہ کی نافرمانیاں کر کے کہیں دوزخ کے عذاب کے مستحق نہ ہو جائیں، یعنی آپ ﷺ انھیں پکڑ پکڑ کر بار بار سمجھا رہے ہیں بلکہ یہاں تک کہ اپنی امت کے گناہ گاروں کے لیے نماز میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ [سلسلة الأحاديث الصحيحة : ٢٢٥٤] اور یہ سارا کام ایک مشن کے طور پر کر رہے ہیں۔ آج داعیان اور

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝۴ اَلَاۤ اِنَّهُمْ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ

تم (سب) کو اللہ کی طرف پلٹ کر جانا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ④ خبردار! بے شک وہ اپنے سینوں کو

علمائے کرام کا بالکل یہی انداز ہونا چاہیے۔

آیت 4 ﴿ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ . . . : بندہ جس قدر چاہے نافرمانیاں کر لے اسے بالآخر رب تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے، اس کے سوا اور کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ شیطان بعض اوقات بندوں سے بڑی غلطیاں کرواتا ہے کہ معاشرہ یہ کر رہا ہے اور فلاں بندہ یہ کر رہا ہے، لہٰذا تم بھی ایسے ہی کرو تو اس حوالے سے یہ ہے کہ بندے کو کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ جب سب نے مرنے کے بعد اللہ رب العزت کی طرف ہی لوٹنا ہے تو پھر دنیا کی زندگی میں بھی اس ذات باری تعالیٰ کا ہی حکم ماننا چاہیے اور کتاب وسنت کی تعلیمات پر صحیح معنوں میں عمل پیرا ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ وہ سزا اور عذاب دینا چاہے تو کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ اس کے سامنے دم مار سکے۔ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی کسی کی سفارش کر کے اس کی پکڑ سے نہیں بچا سکتا۔ وہ قادر اور قدیر رب ہے، جس کے سامنے ہر کسی نے پیش ہو کر حساب دینا ہے۔

آیت 5 ﴿ اَلَاۤ اِنَّهُمْ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِیَسْتَخْفُوْا مِنْهُ : کفار و مشرکین کی غلطیاں بیان کی جارہی ہیں۔ ان کا چونکہ عقیدہ واضح نہیں تھا، وہ توحید کے متعلق جانتے نہیں تھے اور انھیں رب تعالیٰ کی ذات اور صفات کے متعلق صحیح علم نہیں تھا، اس لیے وہ بہت بڑی غلط فہمیوں میں مبتلا تھے۔ یہاں صرف مشرکینِ مکہ ہی کی نہیں بلکہ سب کی بات ہو رہی ہے۔ جس کسی کو بھی خالقِ کائنات کی صفات کا علم نہیں ہوگا اس کا عقیدہ کبھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ مشرکینِ مکہ میں جہاں عقائد کی دوسری بہت ساری غلطیاں تھیں وہیں ایک غلط فہمی یہ بھی تھی کہ وہ سمجھتے تھے ہم اللہ رب العالمین سے چھپا کر غلطی اور گناہ کر سکتے ہیں۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ اگر وہ زنا یا کسی اور جرم کا ارتکاب کرتے تو اپنے سینوں کو موڑ کر ایسا انداز اختیار کرتے کہ غلطی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو نظر نہ آئیں اور وہ انھیں دیکھ نہ لے۔ عربوں کے ہاں یہ غلط فہمی عام پائی جاتی تھی، جیسا کہ بخاری کی ایک روایت میں بھی ہے کہ تین شخص جن کے پیٹوں کی چربی بہت زیادہ تھی اور دلوں کی فقاہت بہت کم تھی اکٹھے ہوئے تو ایک نے سوال کیا کہ کیا اللہ تعالیٰ سنتا ہے؟ تو دوسرے نے کہا کہ اگر زور سے بولو گے تو وہ سنے گا اور اگر آہستہ بات کرو گے تو وہ نہیں سنے گا، تیسرے نے کہا اگر ہم اونچی بولیں تو وہ سن لیتا ہے تو پھر ہم آہستہ بولیں تو بھی وہ سن لیتا ہو گا۔'' اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی: ﴿ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ یَّشْهَدَ عَلَیْكُمْ سَمْعُكُمْ وَ لَاۤ اَبْصَارُكُمْ وَ لَا جُلُوْدُكُمْ ﴾ [فصلت: ۲۲] ''اور تم اس بات سے نہیں چھپ سکتے تھے کہ تمھارے

لِيَسۡتَخۡفُوۡا مِنۡهُ ؕ اَلَا حِيۡنَ يَسۡتَغۡشُوۡنَ ثِيَابَهُمۡ ۙ يَعۡلَمُ مَا يُسِرُّوۡنَ وَمَا يُعۡلِنُوۡنَ ۚ

موڑتے ہیں، تاکہ وہ اللہ سے چھپے رہیں، خبردار! جب وہ اپنے کپڑوں کو لپیٹتے ہیں تو وہ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جسے وہ

کان اور تمھاری آنکھیں اور تمھارے چمڑے تمھارے خلاف گواہی دے دیں۔ '' [صحيح البخاري، كتاب التوحيد، باب قول الله تعالى : ﴿ وما كنتم تستترون أن يشهد عليكم سمعكم ﴾ : ۷۵۲۱]

مشرکین کے ہاں یہ چیز بھی تھی کہ ایک بندہ کپڑا ماپ رہا ہے تو وہ اس میں کمی کر رہا ہے اور دوسرا کوئی چیز تول رہا ہے تو اس میں کمی کر رہا ہے۔ یہ سارا کچھ کر کے وہ سمجھتے تھے کہ ہم اللہ رب العالمین سے یہ چیزیں چھپالیں گے لیکن ایسا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سنتا، دیکھتا اور ہر چیز کے متعلق جاننے والا ہے۔ انسانوں کو تو دھوکا دیا جا سکتا ہے کہ گاہک کے سامنے ماپ تول میں کمی کی جائے اور اسے پتا نہ چلے لیکن رب تعالیٰ کو دھوکا دینا کسی صورت ممکن نہیں ہے۔ یہ مشرکین کی بہت بڑی بے وقوفی تھی کہ وہ خالقِ کائنات کے بارے میں ایسا گمان رکھتے تھے کہ جسم کو تھوڑا سا موڑنے سے وہ اس پر اپنی غلطی ظاہر نہیں ہونے دیں گے۔

اَلَا حِيۡنَ يَسۡتَغۡشُوۡنَ ثِيَابَهُمۡ . . . : '' خبردار! جب وہ اپنے کپڑوں کو لپیٹتے ہیں۔ '' مثلاً رات کے وقت لحاف یا کمبل اوڑھ کر سو رہے ہوں تو کپڑوں کے نیچے سے بھی رب تعالیٰ سے کچھ نہیں چھپایا جا سکتا۔ فرمایا: ﴿ يَعۡلَمُ مَا يُسِرُّوۡنَ وَمَا يُعۡلِنُوۡنَ ﴾ وہ جانتا ہے جو تم پوشیدہ رکھتے ہو یا ظاہر میں کرتے ہو، کپڑے کے اندر جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی خالق کائنات کے علم میں ہے، کیونکہ وہ تو '' عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ '' ہے، یعنی وہ تمھارے سینوں کی باتیں بھی جاننے والا ہے۔ جب عقیدے کی خرابیاں آتی ہیں تو انسان اس قسم کی غلطیاں کرتا ہے۔ اس سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ اصلاح عقیدے سے ہوتی ہے۔ اللہ کی توحید کا عقیدہ انسان کو سیدھا رکھتا ہے۔ بندے کو یقین ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے، میں اس کے سامنے ہوں اور میں اپنے کسی عمل کو اس ذات باری تعالیٰ سے چھپا نہیں سکتا۔ میں دروازہ بند کر کے دنیا سے تو چھپ جاؤں گا اور کوئی مجھے پکڑ نہیں سکے گا لیکن اللہ رب العالمین تو بند دروازوں کے اندر بھی دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ حقیقت ہے کہ عقیدۂ توحید ہی بندے کو غلطیوں سے بچاتا اور محفوظ رکھتا ہے۔ مکہ والوں کو یہ چیز میسر نہیں تھی۔ ان کا عقیدہ غلط تھا اور وہ یہ سوچ کر گناہ پر گناہ کرتے چلے جاتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کو کچھ معلوم نہیں ہو رہا۔ آج مسلمانوں میں بھی اس قسم کی بہت ساری غلطیاں پائی جاتی ہیں جن کی اصلاح ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مشرکین کی طرف سے کپڑے اوڑھ لینے، پردوں میں چلے جانے، اپنے سینے نیچے کر کے جسم کو موڑ کر گناہ کرنے اور اپنے آپ کو رب تعالیٰ سے چھپانے کی بات کی ہے تو یہ درحقیقت کافروں کے رویوں

اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ⑤

ظاہر کرتے ہیں، کیونکہ وہ سینوں کے رازوں کو خوب جاننے والا ہے⑤

پر تنقید ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی ایک تفسیر یہ بھی کی ہے کہ مسلمان جب قضائے حاجت کے لیے جاتے تو وہ کوشش کرتے تھے کہ ہم اپنی شرم گاہوں کو ایسے انداز میں نہ رکھیں کہ اوپر سے کوئی دیکھے، ایسے ہی وہ جماع کرتے وقت خود کو چھپاتے تھے کہ آسمان کی طرف رخ نہ ہو اور اوپر سے نظر نہ آئے۔ [دیکھیے صحیح البخاري، کتاب التفسیر، سورۃ ھود : ٤٦٨٢] مسلمانوں کے اندر فطری طور پر شرم و حیا ہوتی ہے اور اسی حیا کی وجہ سے وہ رب تعالیٰ سے شرماتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسی شرم و حیا کا تذکرہ مسلمانوں اور ایمان والوں کے حوالے سے کیا اور یہ تفسیر بیان کی ہے لیکن اکثر مفسرین نے سیاقِ کلام سے اسے کافروں کی طرف منسوب کر کے ان کے عقیدے کی خرابی کو بیان کیا ہے۔ یہی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

الجزء ۱۲ وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِي الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزۡقُهَا وَ يَعۡلَمُ مُسۡتَقَرَّهَا وَ مُسۡتَوۡدَعَهَا ؕ

اور زمین میں کوئی چلنے پھرنے والا نہیں مگر اس کا رزق اللہ کے ذمے ہے اور وہ اس کے ٹھہرنے کی جگہ اور اس کے سونپے

آیت 6 ﴾ وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِي الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزۡقُهَا: اس آیت میں اللہ رب العالمین کی قدرتوں کے کمالات بیان کرتے ہوئے کہا جارہا ہے کہ رزق دیا جانا بھی اسی ذات باری تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ ہر جان دار حرکت کرنے والے پر دابہ کا لفظ بولا جاتا ہے، فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنۡ مَّآءٍ ۚ فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّمۡشِيۡ عَلٰى بَطۡنِهٖ ۚ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّمۡشِيۡ عَلٰى رِجۡلَيۡنِ ۚ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّمۡشِيۡ عَلٰۤى اَرۡبَعٍ ﴾ [النور: ٤٥] کچھ جان دار وہ ہیں جن کے قدم نہیں ہوتے اور وہ اپنے پیٹ کے بل چلتے ہیں، مثلاً سانپ وغیرہ، اسی طرح بعض وہ ہیں جن کی چار ٹانگیں اور بعض کی دو ہوتی ہیں، ان سب کو "دَآبَّةٍ" کہتے ہیں۔ جتنے بھی جان دار ہیں چاہے وہ انسان، حیوانات، کیڑے مکوڑے اور دوسری حرکت کرنے والی چیزیں ہیں، ان سب کو زندہ رہنے کے لیے کھانے پینے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نظام ہی یہ رکھا ہے کہ مخلوق میں جو بھی جان دار سانس لیتا، چلتا پھرتا اور حرکت کرتا ہے وہ ضرور کھائے پیے گا۔ وہ خوراک حاصل کر کے ہی اپنی زندگی برقرار رکھ سکے گا۔ اللہ رب العزت نے فطرت میں سب کے لیے ایک ہی اصول مقرر کیا ہے۔ جب اس نے کھانے پینے کی اشتہا اور ضرورت رکھی ہے تو پھر اس کا بندوبست کرنا بھی اپنے ذمہ لیا ہے۔ جس طرح پیدا کرنے والی ذات اللہ کی ہے ایسے ہی انسانوں، جانوروں اور کیڑوں مکوڑوں کو رزق دینے والا بھی وہی ہے۔ پتھر کے اندر موجود کیڑوں کو بھی اللہ تعالیٰ ہی خوراک مہیا کرتا ہے۔

مشرکینِ مکہ کو یہ بات سمجھائی جارہی ہے کہ تم اپنے بتوں اور خداؤں کو مشکل کشا اور حاجت روا قرار دے کر ان سے مرادیں طلب کرتے اور انھیں اپنا رازق سمجھتے ہو، حالاں کہ یہ سارا کام تو اللہ رب العالمین کا ہے۔ تم تو اپنے ان بتوں سے مانگ لیتے ہو لیکن یہ جانور اور کیڑے مکوڑے تو کسی سے مانگ بھی نہیں سکتے، انھیں خوراک کہاں سے حاصل ہوتی ہے؟ جو رب کیڑے مکوڑوں اور دوسرے جان داروں کو رزق دیتا ہے وہی تمھیں بھی عطا کرتا ہے۔ زمین کی طرح سمندروں میں کس قدر زیادہ مخلوقات ہیں اور زمین پر جانوروں اور پرندوں وغیرہ کی کتنی قسمیں ہیں لیکن سبھی کھاتے پیتے ہیں اور اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ جب انھیں سب کچھ مل رہا ہے تو تم انسان ہو کر بتوں اور جعلی خداؤں کی پوجا کرنے لگ گئے ہو۔ تم کائنات کے نظام پر غور و فکر کیوں نہیں کرتے اور اس بات کی طرف توجہ کیوں نہیں دیتے کہ جانوروں، پرندوں اور کیڑوں مکوڑوں کو رزق کون دے رہا ہے؟ اللہ تعالیٰ جب انھیں دے رہا ہے تو تمھیں بھی دے گا۔ تمھیں اِدھر اُدھر بھاگنے اور بتوں سے یا درگاہوں اور آستانوں پر جا کر غیر اللہ سے مانگنے اور

كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ۝۶

(یعنی دفن کیے) جانے کی جگہ کو جانتا ہے، ہر چیز واضح کتاب میں موجود ہے⑥

نذر و نیاز دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((لَوْ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَوَكَّلُوْنَ عَلَى اللهِ حَقَّ تَوَكُّلِهِ لَرُزِقْتُمْ كَمَا يُرْزَقُ الطَّيْرُ، تَغْدُوْ خِمَاصًا وَتَرُوْحُ بِطَانًا)) [سنن الترمذي، أبواب الزهد، باب في التوكل على الله: ٢٣٤٤] ''اگر تم اللہ پر اس طرح توکل کرتے جس طرح اس پر توکل کرنے کا حق ہے تو تمھیں اسی طرح رزق دیا جاتا جس طرح پرندوں کو رزق دیا جاتا ہے، وہ صبح کو خالی پیٹ ہوتے ہیں اور شام کو سیر ہوتے ہیں۔''

اللہ رب العالمین نے جس طرح جانوروں، پرندوں اور کیڑوں مکوڑوں کو رزق دینے کا نظام بنایا ہے ایسے ہی انسانوں کو اس بات کا پابند بنایا گیا ہے کہ تم خود کماؤ گے اور محنت کرو گے تو تمھیں رزق ملے گا۔ گھر میں بیٹھے بٹھائے لقمہ تمھارے منہ میں نہیں آئے گا۔تم اللہ کے حکم کو پورا کرو گے تو تمھارے رزق میں برکتیں عطا کی جائیں گی۔ کافر دنیا میں محنت کرتا ہے تو اسے اس کی محنت کے مطابق دنیا میں بدلہ مل جاتا ہے جبکہ مسلمان محنت کرتا ہے تو اسے دنیا میں بھی برکتیں حاصل ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ اس کے رزق کو بڑھا دیتا ہے۔ اللہ رب العزت نے ایمان والوں کے لیے اپنے فضل سے اضافہ فرمایا ہے لیکن اصول یہ ہے کہ بندے کو محنت کرنا پڑتی ہے اور یہی اصل ہے۔عقیدہ یہ نہیں ہے کہ بندہ گھر میں بیٹھا رہے محنت ہی نہ کرے اور کہے کہ میرا رزق اللہ کے ذمے ہے۔ یہ اللہ کے نظام کو نہ ماننے والی بات ہے۔جس طرح ساری مخلوقات ایک اللہ وحدہ لاشریک کی پابند ہیں ایسے ہی انسان بھی اس کے پابند ہیں۔ رب تعالیٰ نے رزق کے حصول کے جو ذرائع اور وسائل رکھے ہیں انسانوں کو بھی انھیں اختیار کرنا چاہیے۔ یہ اللہ کا حکم ہے اور اس پر عمل ضروری ہے، البتہ بندے کا یقین اسی بات پر ہونا چاہیے کہ رزق دینے والی ذات اللہ رب العالمین ہی کی ہے۔ بسا اوقات انسان بڑی محنت کرتا اور کاروبار میں سرمایہ خرچ کرتا ہے لیکن ملتا کچھ نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خالقِ کائنات نے نفع و نقصان اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ یہ عقیدے کی بات ہے اور اس کی اصلاح بہت ضروری ہے۔

وَ يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا: ''اور وہ اس کے ٹھہرنے کی جگہ اور اس کے سونپے (یعنی دفن کیے) جانے کی جگہ کو جانتا ہے۔'' ماں کے پیٹ میں بچہ کتنی دیر ٹھہرے گا، پھر پیدا ہونے کے بعد وہ دنیا میں کہاں کہاں اور کتنی مدت تک ٹھہرے گا؟ یہ سب کچھ اللہ رب العالمین کے علم میں ہے۔ ''**مُسْتَقَرَّهَا**'' سے مراد ہے کہ قرار کی جتنی جگہیں ہیں سب رب تعالیٰ کے علم میں ہیں، کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہے۔ساری مخلوقات آدم علیہ السلام کی صلب سے منتقل ہو چکی ہیں۔

وَ هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ وَّ کَانَ عَرۡشُہٗ عَلَی الۡمَآءِ

اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور اس کا عرش پانی پر تھا، تاکہ تمھیں آزمائے کہ کون تم

قیامت تک یہ روحیں آتی رہیں گی اور پیدا ہوتی رہیں گی۔ صلبوں میں ان روحوں کا ٹھہرنا اللہ رب العالمین کے علم میں ہے۔ اس کے بعد ماں کے پیٹ میں نطفے کے ساتھ وہ روحیں منتقل ہوتی ہیں۔ یہ روحیں کتنے دن یہاں رہیں گی اس کے متعلق صرف وہی جانتا ہے۔ ایسے ہی پیدا ہونے کے بعد دنیا میں کہاں ٹھہرنا ہے اور کہاں سے رزق حاصل کرنا ہے، یہ ساری چیزیں رب تعالیٰ ہی کے علم میں ہیں۔ ''مُسۡتَوۡدَعَهَا'' (سونپے جانے کی جگہ) سے مراد قبر ہے، جیسا کہ طبری نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے۔ [تفسير الطبري : ١٢/ ٣٢٦] بندے نے طبعی موت مر کر قبر میں جانا ہے، پانی میں ڈوب کر مرنا ہے، کسی جان دار کے پیٹ میں چلے جانا ہے یا کسی اور طریقے سے اسے موت آئے گی تو یہ چیز انسانوں کے بس میں نہیں ہے۔ کوئی علم اور فن اسے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ سارا علم رب تعالیٰ کے پاس ہے۔ اس کے سوا اور کوئی کچھ نہیں جانتا۔

کُلٌّ فِیۡ کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ: اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کی بنیاد پر انسانوں کی پیدائش سے پہلے اور بعد کا وقت اور دوسری سب چیزوں سے متعلق لوح محفوظ میں لکھ دیا ہے۔ سب کی تقدیر لکھی جا چکی ہے اور اسی کے مطابق سارا نظام چل رہا ہے۔

آیت 7 ﴾ وَ هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ . . . : اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ ہم نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا ہے۔ سورۂ حم السجدہ (٩ تا ١٢) میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ ایسے ہی سورۂ یونس اور سورۂ اعراف میں بھی اس کے متعلق بیان ہو چکا ہے۔ خالقِ کائنات نے دو دن میں زمین بنائی، دو دن میں پہاڑ، نباتات، جمادات اور زمین کے اوپر موجود دوسری چیزیں بنائیں اور پھر دو دن میں تہ بہ تہ آسمان بنائے گئے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنوں سے کیا مراد ہے؟ ہمارے ہاں مکمل دن چوبیس گھنٹے کا ہوتا ہے، جس میں دن کے ساتھ رات بھی شامل ہے۔ یہ دن سورج کے ساتھ متعلق ہے، اللہ رب العالمین فرماتے ہیں: ﴿ وَ اِنَّ یَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّکَ کَاَلۡفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ ﴾ [الحج : ٤٧] ''اور بے شک ایک دن آپ کے رب کے نزدیک تمھاری گنتی کے اعتبار سے ہزار سال کے برابر ہے۔'' یا تو اس سے مراد وہ ایک ہزار سال کے چھ دن ہیں اور یا پھر ''فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ'' سے مراد چھ مرحلے ہیں کہ ایک مرحلہ مکمل ہو گیا تو اس کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا مرحلہ ہے۔ بہرحال یہ عالم بالا کا واقعہ ہے جس کو دنیا سے کوئی نسبت نہیں اس لیے اس دن کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، ہم قطعیت کے ساتھ کوئی بات نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تو ''کُنۡ'' کہہ کر سب کچھ پیدا کر دیتا۔ اس کی قدرت میں یہ ساری چیزیں شامل ہیں لیکن رب تعالیٰ نے یہ سارا عمل تدریجاً چھ مراحل میں مکمل کیا ہے۔ اس لحاظ سے تدریج بھی گویا بہت پسندیدہ چیز ہے۔ بعض مفسرین

لِيَبۡلُوَكُمۡ اَيُّكُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ وَلَئِنۡ قُلۡتَ اِنَّكُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِ الۡمَوۡتِ لَيَقُوۡلَنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ ۞۷

میں سے اچھا عمل کرتا ہے اور اگر آپ کہیں کہ بے شک تم مرنے کے بعد اٹھائے جاؤ گے تو یقیناً کافر لوگ کہیں گے کہ یہ تو صاف جادو ہی ہے ⑦

اور علماء نے اس سے مراد لیا ہے کہ درحقیقت یہی اصل دعوت ہے کہ جلد بازی سے نہیں بلکہ تدریج کے ساتھ اپنے امور کو بڑے منظم انداز میں چلانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

وَ كَانَ عَرۡشُهٗ عَلَى الۡمَآءِ : ''اور اس کا عرش پانی پر تھا۔'' قرآن مجید کی اس آیت کا مفہوم بہت واضح ہے۔ اس میں کسی قسم کا کوئی اشتباہ اور اشکال نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو تخلیق کیا اور اس کائنات میں سب سے بلند خالقِ کائنات کا عرش ہے جس پر رب تعالیٰ کی ذات مستوی ہے، لیکن یہاں یہ بات بیان کی جارہی ہے کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے پہلے اللہ کا عرش پانی پر تھا۔ اب جس طریقے سے اللہ کے قرآن نے بیان کیا ہے ہم بھی اسے اسی طرح بیان کرتے اور تسلیم کرتے ہیں، لہٰذا اس پر بحث مباحثہ کرنا یا اس کی تفصیلات میں جانا کہ یہ عرش کیسا تھا اور اس کی کیفیت کیا تھی؟ یہ درست نہیں ہے۔ اس کی کوئی مثال بیان نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی دل و دماغ میں اس حوالے سے کوئی تخیل لایا جاسکتا ہے۔

لِيَبۡلُوَكُمۡ اَيُّكُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا : ''تا کہ تمھیں آزمائے کہ کون تم میں سے اچھا عمل کرتا ہے۔'' اللہ رب العالمین نے تخلیق کے وسیع و عریض سلسلہ کے بعد اس زمین میں انسانوں کو بسایا۔ سب سے اشرف مخلوق انسان ہیں۔ زمین و آسمان، سورج، چاند اور ستاروں سمیت ساری چیزیں انسان کے فائدے کے لیے ہیں۔ یہ چیزیں اس لیے بنائی گئی ہیں تاکہ انسانوں کا امتحان لیا جائے کہ کون ایک دوسرے سے زیادہ سبقت لے جانے کے لیے اچھے اعمال کرتا ہے اور کون نافرمانیوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ یہ دنیا میں رب تعالیٰ کی فرماں برداری کا ایک مشن ہے۔ بندوں میں سے عمل میں جو کوئی اچھا ہوگا اس کا انجام بہتر ہوگا۔

وَلَئِنۡ قُلۡتَ اِنَّكُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِ الۡمَوۡتِ . . . : اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے نبی! اگر آپ مکہ والوں سے کہیں کہ ہر کسی نے مرنے کے بعد اٹھنا اور اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے، تم دنیا میں جو کچھ کر کے جاؤ گے قیامت کے دن اس کا حساب ہوگا اور یہ امتحان ہے جس کا نتیجہ مرنے کے بعد جنت اور دوزخ کی شکل میں ملنا ہے تو یہ ماننے سے انکار کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو واضح اور کھلا جادو ہے۔ تمھارے اوپر جادو کے اثر کی وجہ سے سحر زدہ باتیں

وَلَىِٕنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰۤى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ
يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۠ ۸ ع ۸

اور البتہ اگر کچھ مدت مقرر کے لیے ہم ان سے عذاب کو مؤخر کر دیں تو یقیناً وہ کہیں گے اس کو کس نے روکا ہے؟ خبردار! جس دن ان کے پاس وہ (عذاب) آجائے گا تو ان سے ٹالا نہیں جا سکے گا اور ان کو گھیر لے گی وہ چیز جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے ⑧

تمھاری زبان پر ہیں۔ ہم تمھاری بات کسی صورت تسلیم نہیں کرتے۔ گویا آپ ﷺ کی دعوت کا انکار کرنے کے لیے وہ ان چیزوں کا سہارا لے کر طعن و تشنیع کرتے تھے۔ مشرکین کو یہ بات پسند ہی نہیں تھی کہ انھیں آخرت کی دعوت دی جائے، حالاں کہ آخرت کی دعوت ہی سے دنیا سنورتی ہے۔ جب انسان کا ایمان اس چیز پر ہو کہ آخرت میں حساب ہونا اور جنت و دوزخ کے فیصلے ہونے ہیں تو بندہ دنیا میں بھی اپنی اصلاح کرتا ہے لیکن اگر یہ چیز نہ ہو تو ایسے لوگوں کو پھر آخرت کی بھی کوئی فکر نہیں ہوتی۔

آیت 8 ﴿وَلَىِٕنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰۤى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ﴾: اللہ رب العزت کا بہت بڑا فضل ہے کہ وہ فوری پکڑ نہیں کرتا بلکہ مہلت دیتا اور عذاب کو مؤخر کرتا ہے لیکن مشرکینِ مکہ میں سے ابوجہل جیسے لوگ عذاب مانگتے اور کہتے تھے کہ اے اللہ! ہم پر پتھروں کی بارش برسا دے۔ [دیکھیے الأنفال : ۳۲] اس آیت میں رب تعالیٰ فرما رہے ہیں: ﴿اِلٰۤى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ﴾ ہم اپنے عذاب کو ایک وقت تک کے لیے مؤخر کر رہے ہیں تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہمیں تو دنیا میں وقت ہی نہیں ملا۔ یہاں "اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ" سے مراد وقت مقرر یعنی گنی ہوئی مدت ہے۔ خالقِ کائنات نے ہر کسی کی مدت مقرر کی ہوئی ہے۔ اس حوالے سے "مَّعْدُوْدَةٍ" کہہ کر واضح کیا گیا ہے کہ یہ ہمیشہ کے لیے نہیں ہے۔ دنیا میں زندگی جتنی بھی لمبی ہو جب وہ گنی ہوئی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ بالآخر ختم ہو جائے گی۔

لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ . . . : "تو یقیناً وہ کہیں گے اس کو کس نے روکا ہے؟" یہ اللہ رب العالمین کا فضل ہے کہ اس نے عذاب کو روک کر رکھا ہوا ہے ورنہ انسانوں کا عمل اور ان کے رویے رب تعالیٰ کے عذاب کو چیلنج کرنے والے ہیں۔ اگر اللہ نے عذاب کو مؤخر کیا ہے تو یہ لوگوں کے فائدے کے لیے ہے۔ فرمایا: ﴿اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ﴾ جس دن وہ عذاب آ گیا اس دن پھر کوئی اسے روکنے والا نہیں ہو گا۔ جب اللہ تعالیٰ خود عذاب نازل کرنے والا ہو تو پھر اس کے علاوہ اسے کوئی روک بھی نہیں سکتا۔ ہمارے ہاں اس سلسلہ میں عقائد کی بہت زیادہ خرابیاں موجود ہیں۔ بہت سارے لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اولیاء اپنے ماننے والوں کو اللہ کی پکڑ سے چھڑا لیں گے

وَ لَئِنۡ اَذَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنَّا رَحۡمَۃً ثُمَّ نَزَعۡنٰہَا مِنۡہُ ۚ اِنَّہٗ لَیَـُٔوۡسٌ کَفُوۡرٌ ﴿۹﴾

اور یقیناً اگر ہم انسان کو اپنی طرف سے رحمت کا مزہ چکھائیں، پھر اس سے وہ چھین لیں تو یقیناً وہ مایوس ہو کر ناشکری کرنے لگتا ہے ⑨

لیکن اگر اللہ کے ولیوں نے پکڑ لیا تو پھر ان سے کوئی نہیں چھڑا سکے گا۔ جب عقیدے میں شرک آتا ہے تو اس طرح کی گمراہیاں پیدا ہوتی ہیں۔ رب تعالیٰ کی پکڑ آ جانے پر کوئی نبی اور ولی اس کے عذاب کو پھیر نہیں سکتا۔ اگر عذاب رکا ہوا ہے تو اسے خود اللہ نے روکا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا اسے روکنے والا نہیں ہے۔

وَ حَاقَ بِہِمۡ مَّا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ: دنیا میں یہ لوگ عقیدۂ آخرت اور جنت و دوزخ سے متعلق باتوں کو جھٹلایا کرتے تھے اور مذاق کرتے تھے کہ گوشت پوست کا یہ انسان مرنے کے بعد کس طرح دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔ وہ کہتے تھے کہ انسانوں کی پوری زندگی کے حساب کتاب کی باتیں عقل وفہم والی نہیں ہیں۔ عاص بن وائل ایک مرتبہ بوسیدہ ہڈیاں اٹھالایا، وہ ان ہڈیوں کو مسل مسل کر ذرہ ذرہ کر کے زمین پر گرا رہا تھا اور کہہ رہا تھا: اے محمد (ﷺ)! کیا ان بوسیدہ ہڈیوں میں جان ڈالی جائے گی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((نَعَمْ، یَبْعَثُ اللّٰهُ هٰذَا ثُمَّ یُمِیْتُكَ، ثُمَّ یُحْیِیْكَ، ثُمَّ یُدْخِلُكَ نَارَ جَهَنَّمَ)) ''ہاں، اللہ اسے زندہ کرے گا، پھر تجھے موت دے گا، پھر تجھے زندہ کرے گا اور پھر تجھے جہنم کی آگ میں داخل کرے گا۔'' [مستدرك حاكم: ٢/٤٦٦، ح: ٣٦٠٦] اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے ان چیزوں کو مذاق بنایا ہوا تھا ہم ان سب کو اپنے سامنے لا کھڑا کریں گے۔ ہمارا عذاب انھیں گھیر لے گا اور جب عذاب کی کیفیت ان کے سامنے آ جائے گی تو پھر یہ وہاں سے کسی صورت بھاگ نہیں سکیں گے۔ ایمان والے وہ ہیں جو دنیا میں غیب پر ایمان رکھتے ہوئے اللہ کے ہر حکم کو تسلیم کرتے ہیں اور کافر وہ ہیں جو انکار کرتے اور مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ رویوں کا فرق ہے اور قیامت کے دن یہ فرق روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گا۔